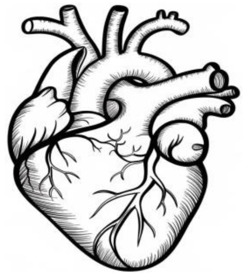
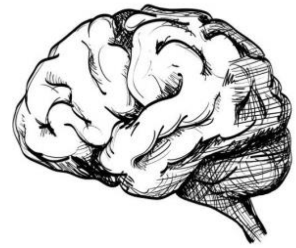
  

تشکیل و تعمیرِ صفات

(نفسیاتی، فلسفی و مذہبی پہلو سے صفات کی بحث)

محمد مرصاد حیدر تیمور آسوی

تشکیل و تعمیرِ صفات

انسان نے جب حیوانیت ترک کر کے شعور کی سطح کو چھوا اور اس میں ہر روز ایک قدم اٹھاتا رہا اور اپنی بنائی ہوئی منزل کی جانب پیش قدمی کرتا رہا تو اس پر شعور کے دریچے کھلتے گئے اس نے زندگی گزارنے سے زندگی کو جینا سیکھا، اور پھر ایسے حصار بنائے کہ ان میں قرار پانے کے نت نئے قوانین و اصول بھی وضع کرتے رہے کہ بس جو ان شیعانِ شعور کا جزو بننا چاہتا ہے اس پر ان تمام لوازمات کا پالن کرنا لازمی ہے اور یوں تغیراتِ نظام سے پروان چڑھنے لگی خصلتیں، اور ان خصلتوں سے لوگوں کے اطوار۔ اور یوں تعین ہونے لگا کسی کا وجود اور اس کا کردار یعنی کہ صفات اس پر استوار اخلاق اور پھر مکمل ہوا کردار۔ اس سارے معمے کو سمجھنے کے واسطے فرداً فرداً ان تینوں اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے تو لہٰذا اس کا آغاز بالترتیب صفات سے کرتے ہیں۔

صفات :

ماحول کے بدلتے ہوئے رنگ، زاویے جو اثرات کسی شے پر چھوڑتے ہیں اس کے سبب متاثر ہونا فقط انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی عمل بن جاتا ہے یوں اس کا اظہار کسی طور پر بھی وقوع ہو سکتا ہے کہ اس ماحول میں جینا یا تو دشوار ہوتا جا رہا ہو گا یا پھر وہ ماحول بہت کارساز انگڑائیاں لے کر سکون کے لمحات کا موجد بن جائے گا۔ ایسے میں دو نقطہ ہائے تحفظات ہمارے سامنے آتے ہیں ایک یہ کہ اس کارساز نظام یا ماحول کو برقرار کیسے رکھا جائے؟ اور دوجا یہ کہ اگر اس فضا میں سانس لینا اذیت ہے تو اس سے چھٹکارا کیوں کر پایا جائے؟ آگے کی جتنی بھی سعی ہے وہ انہی دو اقدام کے پیشِ نظر ہو گی جس میں بصورتِ اول اس مخصوص خطے، ماحول یا نظام کے باسی کسی صورت وہ عوامل اپنے علاقے میں وقوع نہیں ہونے دیں گے، پروان نہیں چڑھنے دیں گے جو ان کے نظام کو خطرے میں ڈالیں لہٰذا اب یہ سب دفاعی طرز میں جیتے رہیں گے اور ان کے اذہان میں زندگی گزارنے کے جتنے طریقے، ایک دوجے سے میل جول کے جتنے انداز، خارجی تعلقات کی جتنی بنیادیں استوار ہوں گی سب کی سب دفاعی انداز میں ہوں گی، اور وصف ان کے چال چلن، سوچ و فکر، پیش قدمی غرض ہر شے میں اثر رکھے گا اور مذکورہ ماحول و نظام کے باسی جو کچھ قوانین بنائیں گے جو کچھ تربیت کریں گے اس میں ایک شے نمایاں ہو گی کہ جس حال میں رہ رہے ہیں ہر حال میں اس حال کو کچھ نا ہو۔ ایک نسل کو اس تگ و دو کی ضرورت ہے آئندہ کی نسلیں یہ فکر وراثت میں لے کر پیدا ہوں گی ان کو فقط تربیت کی ضرورت باقی رہ جائے گی البتہ وہ اس دفاعی نہج پر پہلے سے ہی کاربند ہوں گے اور یوں ہی یہ عمل جب تین چار نسلوں تک تسلسل سے دہرایا جائے گا تو اب کے پیدا ہونے والوں میں یہ سب عادات، خصائل، نظریات راسخ ہو چکے ہوں گے اور لاشعوری میں ایسی پائیداری پکڑ چکے ہوں گے کہ ان سے چھٹکارا ممکن نہیں ہو گا۔ ان باسیوں کے مطابق اگر کوئی ان نظریات سے مفر کرنا چاہے گا تو اسے باغی اور فطرت سے ہٹا ہوا تسلیم کریں گے لہٰذا ایسے شخص کی یا ایسی سوچ والے دماغ کی ان کے درمیان کوئی جگہ نہیں ہو گی۔

یہ وہ خصائل ہیں جو کسی بھی مخلوق میں من جانب اللہ یا اگر مذہب سے ہٹ کر بات کریں تو فطرتاً موجود ہوتی ہیں۔ اب یہاں پر اگر ہم دوسری صورت پر نظر ڈالیں تو دشوار ماحول میں جینے کے لیے سخت ہونا ضروری ہے، اگر زندہ رہنا ہے تو برداشت کرنا ہو گا، اگر جینا ہے اور جیتنا ہے تو کسی کی موت آپ کی حیات کا پروانہ ہو گی یوں ایسے سنگدل ماحول و نظام میں رہنے کے واسطے کسی بھی فرد میں سخت جاں، سنگ دلی، بے رحمی، چالاکی ایسے خصائل کا پیدا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور ان لوگوں کی سوچ و فکر مکمل طور پر اس نظام کو بدلنے یا پھر اسی دشوار ماحول کو ہر جگہ پھیلانے کی ہو گی، لا محالہ طور پر یہاں کے باسیوں کا ایک ہی نظریہ ہو گا کہ کوئی اور نظریہ نا ہو ان کے سوا۔ پچھلے عمل کو دہرائیے تو ان لوگوں کی آنے والی نسلیں بھی یہ سختی، تعصب، بے رحمی وراثت میں لے کر پیدا ہوں گی اور اولادیں اپنے باپ داداؤں سے بڑھ کر ان خصائل میں نام پیدا کریں گی۔ وہ خود تو اس ماحول میں جینے اور جیتے رہنے کا فن سیکھ چکے ہوں گے مگر وہ ہر گز نہیں چاہیں گے کہ کوئی اور ان سے الگ دنیا بسا کر جیے۔

ایک بات صاف کہتا چلوں کہ فطرت یہ نہیں کہتی کہ آپ فقط آرائش کی زندگی جیو اور بے چاروں کو نظر انداز کرو اور نا ہی یہ احساس فطری ہے کہ سبھی کو مجبور کیا جائے اپنے بنائے حصار میں رہنے کے واسطے مگر فطرت میں ایک چیز مسمم ہے اور وہ ہے زندہ رہنا۔ اس کے واسطے جو بھی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ جان ور کا اپنا ہے کہ وہ کسی کی حیات چھین کر اپنی زندگی کو دوام بخشے یا کسی کے ساتھ اپنی زندگی بانٹ کر جیے۔ غرض یہ کہ مذکورہ بالا دونوں نظام و ماحول کا ذکر کرنے سے جس شے کی جانب میں نے اپنا مقدمہ کھینچا ہے وہ یہ کہ "ماحولیاتی، علاقائی اور وراثتی اثرات سے کسی فرد میں مرتب ہونے والے خصائل جو کہ لاشعوری میں پائیداری پکڑ جائیں اس کی صفات کہلاتی ہیں"۔

اسی کے پیشِ نظر بلاشبہ اگر امن کا داعی یا دفاع کا حامی شخص اگر جنگ میں اتر جائے تو وہ ہمیشہ بچنے بچانے کو ترجیح دے گا، جنگ سے قبل دفاع کا مشورہ اور بعد از قتال در گزر کی فرمائش غرض اس کا جنگ میں اترنا اس کی صفات کے بر عکس نہیں ہو گا کہ حتمی فیصلے کے وقت وہی کرے گا جو اس کی صفت ہے اور یوں ہی ایک بے باک شخص بھلے معاملہ کیسا ہو وہ اس میں جب حساب لے گا تو بہت بے رحم ہو گا کہ کسی طور بھی جو صفات اس میں آ چکی ہیں وہ ختم نہیں ہوں گی الا کہ وہ ایک اچھی راہ پر گامزن ہو بھی جائے اچھے فیصلے کرنے بھی لگے تو بھی وہ نظم کی پابندی کروانے یا فیصلہ سازی میں سخت ہی رہے گا تو ثابت یہ ہوتا ہے کہ نوعیت اگرچہ بدل جائے مگر صفات باقی رہتی ہیں اور ان کے بغیر موصوف کا تشخص ہر گز باقی نہیں رہتا۔

اگر ہم لفظ صفت کا لغوی اعتبار سے ہی مطالعہ کریں تو معلوم پڑتا ہے کہ "وہ وصف یا خاصیت جو کسی چیز کی پہچان ہو اور اس سے الگ نا ہو سکے"، یعنی ذاتِ موصوف اور اس کی صفت لازم و ملزوم ہے بغیر صفت کے کسی ذات کا تصور مخلوقات میں سے باقی نہیں رہتا کہ جب ہی کسی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کی صفت کا ذکر ہونا شرط ہے کسی کے متعلق رائے کے قیام میں صفات کا اظہار پیش پیش ہے۔ اور اگر ہم مزید اس کی تعریف کی گہرائی میں جائیں تو اصطلاح میں یوں بیان کیا جائے گا کہ "صفت ایک بنیادی اور پائیدار خاصیت یا خصوصیت ہے جو کسی شخص، چیز یا وجود کے حقیقی جوہر کا حصہ ہوتی ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کے بغیر وہ شخص یا چیز وہ نہیں رہتی جو وہ ہے"۔ متعلقہ بحث سے فقط ایک شے ثابت کرنا مقصود ہے کہ ہر قسم کا تغیر جو کسی شے کا لازمی جزو بن جائے کہ اس کے بغیر شئی کا وجود بھی وہ نا رہے جو وہ ہے تو یہ وصف اس شئی

کی صفت کہلائے گی۔ اور اگر اس بحث کو ہم فقط انسانوں میں سمیٹ کر آگے بڑھیں تو صفات وہ بنیادیں ہیں جو آگے چل کر اخلاق اور پھر کردار کے واسطے بنیاد کا کردار ادا کرتی ہے اگر صفات کا وجود نہیں تو کسی انسان کا وجود نہیں ہے کوئی شخص یا تو اپنی صفات میں فرشتہ ہے یا حیوان اور یہی شے اس کے خلق اور پھر اس کے کردار کا تعین کرے گی کہ وہ کسی کا ہمدرد بنتا ہے یا بے حس جانور، الغرض انہی دو خصائل سے بر سرِ پیکار رہنے کا نام انسان ہے۔ فقط ایک جسم لیے اور تذکیر و تانیث کی علامات اپنے جسم پر سجائے کوئی انسان نہیں کہلا تا بلکہ انسان ہونا ہی ایک وصف ہے جو نہ نور کو وارد ہے نہ نار کو عطا ہوا ہے لیکن یہ خاک زادہ جب اپنی صفات سے منہ موڑ تا ہے، یہ ان خصائل سے ہٹتا ہے تو پھر مقام بشریت سے بہت اوپر جانے لگتا ہے جو کہ فنا ہے یا پھر مقام بندگی سے بہت نیچے گر جاتا ہے جو رسوائی ہے لہٰذا پائیداری یہی ہے کہ انسان جو ہے وہ انسان ہی رہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کل

ؔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

نفسیاتی نقطہ نظر:

انسان نے جیسے جیسے علوم کی سطحوں کو سر کیا اور معاشرے کو جانچنے، سمجھنے کا قصد کیا تو کھلی فضاء میں بکھرے ہوئے رویے، انداز اور رجحانات کو زینتِ قرطاس کرنا شروع کر دیا کہ اب تجربات کی ایک لمبی زندگی صرف کرنے کی بجائے صفحات میں ہی اقوام کے طور طریقے، چال چلن اور میل جول کے انداز، ان کے نظریات و افکار کیسے ہیں معلوم کر لیے جائیں اور یوں اس سب کو سیکھنا یا سمجھنا کسی بھی فرد، معاشرے یا قوم کی نفسیات کہلانے لگی۔ دورِ جدید میں چونکہ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور اس کے بغیر فلسفہ و مذہب بھی اپنی تکمیل کو ادھورے ہیں تو اب چاہے آپ کسی کو کوئی وعظ دینا چاہیں، کو تبشیر سنانا چاہیں، سنوارنا چاہیں یا بگاڑنے کا عزم کریں آپ کو اپنے حریف کی نفسیات کو جاننا ہے اور ان کے مطابق عمل کرنا ہے یوں سالوں کا عمل لمحوں میں مکمل ہو جائے گا۔ تو اس فن کے تناظر میں اگر ہم صفات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم یہ پڑتا ہے کہ تعریف سابقہ کی طرح ہی "صفت وہ بنیادی اور پائیدار خصوصیت ہے جو کسی شخص کی شخصیت کا مستقل حصہ ہوتی ہے"، لہٰذا اسے مزید تفصیل میں سمجھنے کے لیے ہم یہاں ماہر نفسیات گورڈن آل پورٹ (Gordon All port) کی بیان کردہ خصوصیات کی تین اقسام سامنے رکھتے ہیں:

1. بنیادی خوبیاں :(Cardinal traits) یہ وہ صفات ہیں جو پوری شخصیت پر حاوی ہوتی ہیں۔ اور یہ اتنی طاقتور ہوتی ہیں کہ کوئی انسان اپنی پہچان انہی صفات سے دیتا ہے۔ جیسے کہ کسی فرد کا "مشہور انسان دوست" ہونا یا پھر "انتہائی با اخلاق" ہونا مکمل تعارف ہو سکتا ہے۔
2. مرکزی خوبیاں :(Central traits) ان میں وہ صفات شامل ہیں جو کسی شخصیت کی بنیاد ہوتی ہیں۔ جس میں کسی کا ایماندار ہونا، مہربان ہونا یا پھر ذہین ہونا شامل ہوتا ہے۔

3. ثانوی خوبیاں :(Secondary traits) یہ وہ صفات ہیں جو بعض مخصوص حالات میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ مستقل نہیں ہوتی بلکہ کسی ماحول یا بات کے اثر میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جیسے کوئی منظر یا فلم دیکھتے ہوئے جذباتی ہو جانا جب کہ معلوم بھی ہو کہ وہ حقیقی نہیں ہے۔[1]

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ تقسیم اس تغیر کی کفایت کر رہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ کس طرح کسی شخص میں کچھ صفات مستقل کو جاتی ہیں پھر اس کا تعارف ان کے بغیر ممکن نہیں رہتا اور اگر کسی اور ماحول کے اثر سے یا کسی خارجی اصلاح کے تعاون میں اس کی صفات بدلنا بھی شروع کر دیں یا اس کا عمل صفاتِ سابقہ سے تعارض ہوں تو بھی حقیقتاً اصل مدعے میں وہی صفات سامنے آئیں گی جو مستقل ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس کی نوعیت یا شدت میں فرق واقع ہو جائے لیکن کسی طور بھی کوئی شخصیت اپنی صفاتِ اصلیہ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ تغیراتِ زمانہ سے شخصیات بدلتی رہتی ہیں اور یوں اس کی خصوصیات و خصائل میں بھی تبدیلی کا وقوع ہونا کوئی مضائقہ نہیں ہے اسی طرح ایک شخص اپنی پوری زندگی میں اپنی صفات اور خصائل کا مظہر ہوتا ہے اور نئی صفات یا مستقل صفات کا بار بار اظہار و تکرار کا منبع بن جاتا ہے اور اگر ہم اس کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کر سکتے ہیں کہ

Personality trait: "a relatively consistent pattern of thinking, feeling and behaving that an individual exhibits across a variety of situations and over an extended period of time"

یعنی "ایک مستقل نمونہ سوچنے، محسوس کرنے اور رویے کا جو ایک فرد مختلف حالات اور ایک طویل عرصے میں ظاہر کرتا ہے"۔[2]

جدید تحقیقی مقالے کے مطابق تخصیتی صفات Personality traits کی پیمائش کے لیے Big Five ماڈل بہت مقبول ہے۔ یہ پانچ بڑی صفات:

1. کھلا پن(openness)
2. احتیاط اور ذمہ داری(conscientiousness)
3. برونیت(extraversion)
4. خوش مزاجی(agreeableness)
5. اعصابی پن (neuroticism) شامل ہیں۔[3]

---

[1] (All port GW, "pattern and growth in personality" , Holt, Rinehart and Winston, 1961, Chapter 8, pg: 334 - 372)

[2] (Powers AD, "Personality", Encyclopedia of Human behavior, second edition 2012, pg: 39 -44)

[3] (McCrae RR, Costa PT Jr, "A Five-factor Theory of Personality", Handbook of Personality: Theory and Research, third edition, Guilford Press 2008, pg: 159 - 181)

ان پانچوں کو "Big Five Personality traits" کہا جاتا ہے۔ تحقیق بتاتی ہے کہ صفات نسبتاً مستحکم ہوتی ہیں اور ان کی جینیاتی بنیاد ہوتی ہے۔ ہمارے خیال سے اس پر مزید بحث ہو سکتی ہے مگر وہ مضمون کو طویل کر دے گی لہٰذا عام فہم بھی مدعا سمجھ گیا ہو گا اس واسطے ہم اس بحث کو یہیں پر ختم کرتے ہیں۔

فلسفی نقطہ نظر:

جیسا کہ عرض کیا ہے کہ یہ ساری رسم ولیلا شعور آنے کے بعد رچی ہے تو یعنی جب عقل نے اپنا کام کیا تو انسان نے طرح طرح کے علوم وفنون ایجاد کیے اور ہر شے کو عقل پر پرکھنا شروع کیا اس سے ہمیں مقاصدِ وجود اور جہان آوری کا سبب معلوم ہوتا ہے، ہر شے جو ہم دیکھتے ہیں اس پر اپنی رائے دینے کا حق رکھتے ہیں اور انسان کی یہ خوبی سمجھیں یا خامی وہ ہر شے کو ایک نئی تعریف دینا چاہتا ہے اور جب عقل کے پیمانوں پر کسی شئ کو پرکھ لیتا ہے تو کہلاتا ہے فلسفہ۔ اور یوں فلسفے میں کسی شئ کی ذاتی خاصیت اس کی صفت ہوتی ہے۔ اگر ہم ارسطو کو پڑھیں تو اس نے مقولات میں ہر وجود کی دو طرح کی خصوصیات ہوتی ہیں:

1. ذاتی صفات :(Essential attributes) وہ صفات جو کسی چیز کے جوہر essence کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان کے بغیر وہ چیز وہ نہیں رہتی۔
2. عارضی صفات :(Accidental attributes) وہ صفات جو کسی چیز میں موجود تو ہوتی ہیں لیکن اس کے جوہر کا حصہ نہیں ہوتیں۔ یہ بدل سکتی ہیں۔

مزید ارسطو لکھتا ہے کہ :

"An attribute is that which is affirmed of a subject, but is not the subject itself"

یعنی "صفت وہ ہے جو کسی موضوع subject کے بارے میں کہا جاتا ہے لیکن خود وہ موضوع نہیں ہوتا"۔ (4)

لہٰذا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ واقعتاً صفات کا تشکیل پانا اور اس کے محرکات میں سے فقط یہ دو چیزیں ہی موضوع بنتی ہیں صفت خود کوئی موضوع کیسے ہو سکتی ہے کہ اس کا وجود نہیں ہے بس اظہار ہے جس کے لیے موصوف کا ہونا ضروری ہے اور صفات کے بننے میں فکر اور پھر اس سوچ کی توسیع کا ہی ہاتھ نمایاں ہوتا ہے جو کہ تکرار یا بار بار اظہار کی صورت میں نظر آتی ہیں لہٰذا ہم نے جو مدعا کھینچا ہے وہ کسی طور بھی غلط نہیں ان تفکرات و فلسفوں سے جو ماہرین نے طے کیے تھے، مزید اس کی وضاحت میں اسپینوزا (Spinoza 1632-1677) نے اپنی مشہور کتاب Ethics میں اس کی تعریف یوں کی ہے کہ:

"By attribute mean that which the intellect perceives of a substance as constituting its essence"

صفت سے میری مراد وہ ہے جسے عقل کسی جوہر substance کے بارے میں اس کے جوہر کی تشکیل کے طور پر سمجھتی ہے۔ (5)

اسپینوزا کے مطابق ہر جوہر کی لامتناہی صفات ہوتی ہیں لیکن انسان کی عقل صرف دو صفات کو سمجھ سکتی ہے:

- فکر(Thought)

---

(4) (Aristotle, Categories, chapter 5, translated by E.M Edge hill, the internet classic Archive)

(5) (Spinoza, Ethics, part 1, Definition IV, translated by R.H.M Ewes, project Gutenberg)

- توسیع(Extension)

مذہبی نقطہ نظر:

اسی طرح اگر ہم علم الکلام میں ان تعریفات کو ایک بار اور دیکھتے جائیں تو "صفت وہ معنی ہے جو کسی ذات کے لیے ثابت ہو، خواہ وہ ذات موجود ہو یا نا ہو" اور یوں اسے دو طرح سے تقسیم کرتے ہیں:

1. صفاتِ ذاتیہ: وہ صفات جو کسی ذات سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ جیسے حیات یہ ایک صفتِ ذاتیہ ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے یہ اس میں موجود ہے۔
2. صفاتِ فعلیہ: وہ صفات جو کسی ذات میں ایک وقت تو ہوتی ہیں اور دوسرے وقت نہیں ہوتیں۔ جیسے کہ کسی انسان کا چلنا، جب وہ بیٹھ جائے تو یہ صفت ختم ہو جائے گی۔

غرض یہ امثال فقط سمجھانے کو تھیں کہ کس طرح کچھ صفات ذات میں شامل ہوتی ہیں جن کا ایک خاص وقت کے لیے جڑا رہنا ضروری ہوتا ہے اور کچھ صفات عارضی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ یا فقط لمحات کے بدلنے سے ہی بدل جاتی ہیں۔

ہم بارہا پہلے شعور و عقل کو ذکر چکے ہیں تو یہاں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ بحیثیتِ نوعِ انسان، اس نے جیسے جیسے چیزوں کو، ماحول کو، رویوں کو جانا ویسے ویسے اطوار اپنائے اور دفاع یا برداشت جیسی صفات کو اپنایا اسی اثنا میں لازم تھا کہ پروان چڑھتی عقل کی بیمار اس مخلوق کو صحیح سمت دکھائی جائے اور اس قوم کو جو کہ پستیوں سے اپنی کوششوں اور ہمتوں کے باعث آسمان چھونے کے درپیش ہو گئی ہے اب مزید انتظار نہ کروایا جائے مزید بھٹکنے نہ دیا جائے اور کامل رہنمائی کے واسطے کامل ہدایت کے واسطے کوئی وسیلہ کیا جائے۔ ایسی ٹھوس رہنمائی کی ضرورت تھی جو عقل کی کفالت کرے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ، تذبذب یا اضطراب موجود نا ہو تو اسی واسطے خالق نے اپنی جانب سے ان جیسا ایک وجود پیدا کر کے اسے وہ سب عطا کر دیا جس کے لائق یہ خاک افتادہ مخلوق لاکھوں سالوں کے بعد ہوئی تھی لہٰذا اب ایک ایسے رہنما نے ان کے درمیان قرار پایا جس کا سارا مدعا ایسی ذات کی جانب سے تھا جو نہ انسان ہے نہ اس جیسی ہے غرض وہ مخلوق ہی نہیں ہے اور نومولود عقل نے سب سے اول اس فہم کا ادراک کیا کہ اگر اس ہتھیار باضرر کو کوئی خاص و خالص سمت دینا چاہتے ہو تو اولین فرائض میں سے پہلا فرض ایسی ذات کو حاکم، خالق، آقا، منتظم، محور، مرکز، ملک و مالک تسلیم کرنا ضروری ہے کہ وہ ہمیں قائم رکھے، اور ہماری خرد کو کوئی خاص سمت مل سکے وگرنہ جن بیابانوں سے عقل کا وجود خود وجود میں آیا انہی نا آشنا وادیوں کی خوفناک آہوں میں یہ نور کی کرن دم توڑ جاتی اور پھر سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ایک دوجے کا منہ تکنے، بے وجہ مرنے مارنے کی رسمِ کہن جاری ہو جاتی۔ مدعا آسان یہ کہ بشر اول جنابِ آدم علیہ السلام کے زمین پر آنے کے ساتھ ہی خدا کا وجود بھی دنیا پر آشکار ہوا اور اس وجود کی گواہی دینے کو ایک آدم اپنی تمام خصوصیات سے ایسی قوم کے درمیان اترا جو ہر شے کو ایک نام دینا جانتی تھی جو ہر دکھنے والی چیز کی نئی تعریف کرتی

تھی، لیکن جو ابھی ابتدائی مراحل میں اس حالت میں تھی کہ جلد ہی اپنی تحریک کا دم ٹوٹ جاتا ایسے میں جب انسانوں میں ہر شے کے نام بتانے والا آ گیا، جسے تمام اشیاء کے نام سکھائے گئے تھے، نئ تعریفات کرنے والا آ گیا، تشنہ خرد کی پیاسِ معرفت بجھانے والا آ گیا تو لا محالہ سب انسانیت کا پیشوا ٹھہرا، جو شعور سے آشنا تھے اور خود کو بدلنا چاہتے تھے انہوں نے اس کی پیروی کی اور جن کی صفاتِ رذیلہ ابھی بھی ان کے باطن میں قائم و متحرک تھی وہ انہی کی جانب لوٹے اور اس بشر کامل کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے لہٰذا اب تفریق ہو چکی تھی کہ دنیا میں اگر کوئی جینے کا حقدار ہے تو ان ہی صفات کا متحمل ہو سکتا ہے جس میں کسی دوجے کو بلاوجہ ضرر نا پہنچایا جائے، جس میں نظام عالم کا توازن قائم رکھا جائے لہٰذا اب کھرے کھوٹے کا امتیاز کرنے کے واسطے حدود بھی مقرر ہو گئی اور صفات بھی متعین ہو گئی کہ کونسے اوصاف کا حامل شریف اور کن اوصاف کا متحمل شر پسند و بدماش کہلائے گا۔

چونکہ صفات کسی بھی شخص کے رویے اور کردار کی بنیاد ہوتی ہے تو یہ صفات پیدائشی بھی ہو سکتی ہیں اور تجربات و ماحول کے اثرات سے بھی بنتی ہیں۔ اور یہ عمل محد سے لے کر لحد تک جاری رہتا ہے۔ اب انسان کو اس ذہنی ارتقاء و خارجی اثرات سے مثبت راہ پر گامزن رہنے کے واسطے ضروری ہے کہ کوئی رہنما ہو کوئی عملی نمونہ تو اس کے واسطے جو لوگ یا شخصیات ہمیں نظر آتی ہیں انہیں نبی کہا جاتا ہے اور کل کو ذکر کریں تو انبیاء کہلائے۔ گویا یہ انسان عام نہیں ہوتے بلکہ ان کی تربیت ہو چکی ہوتی ہے اور ان کے افعال بطورِ نمونہ ہوتے ہیں تاکہ انبیاء کا ذہنی ارتقاء انسانوں کے لیے خارجی نمونہ external intellect ہے جس کی پیروی ہمیں اپنی عقل کو پروان چڑھانے کے لیے کرنی چاہیے۔ مذہب کے مطالعہ میں ہمیں جو صفات لازمی کسی فرد کی تکمیل کے واسطے ملتی ہیں وہ بہت بنیادی اور جامع ہیں جن کے بغیر انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا سکون محال ہے۔ ان کو اگر ہم بالکل جامعیت سے پیش کریں تو یہ پانچ ہیں:

1. صبر : جب جب ایک باشعور آدمی اپنے اطراف میں نظر دوڑائے گا تو اسے ہر جانب ایک تذبذب بد نظمی اور ایک اضطراب نظر آئے گا لہٰذا اس کے فہم کا تقاضہ ہے کہ وہ اس بکھرے معاملے کو سمیٹے اور بے مہار لوگوں کی قیادت کرتے ہوئے انہیں باثر شخص بناتے ہوئے ان کی زندگیوں کو بامقصد بنائے لیکن یہ قائدانہ صلاحیت ہر ایک میں پائی نہیں جاتی اس کے واسطے تربیت کے مراحل سے گزرنا اشد ضروری ہے۔ جب انسان کسی کی بھلائی کا بیڑہ اٹھاتا ہے تو بہت سے مراحل ایسے آتے ہیں کہ وہ دل برداشتہ ہو کر رہ جاتا ہے ایسے میں دو راستے ہی بچتے ہیں اول کہ وہ اپنا فریضہ ترک کر دے، دوم کہ وہ خود کو ختم کر دے مگر یہ دونوں صورتیں بزدلی، ناکامی اور شکست کا پیغام ہیں جبکہ صبر ہمیں مستقل مزاجی سکھاتا ہے، صبر نام ہے ڈٹے رہنے کا کہ تمام مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد بھی اپنے مقصد سے پیچھے نا ہٹنا بلکہ جس راہ پر قدم رکھ لیا اب آندھی آئے یا طوفان صبر کے ساتھ اس پر گامزن رہنا اور خندہ پیشانی سے ہر مشکل کا سامنا کسی بھی فرد کو باہمت قائد بناتا ہے اور یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ہدایت کاملہ میں اس صفت کو اپنانے پر زور دیا جاتا ہے لہٰذا ارشادِ باری ہے :" یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" (اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد چاہا کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ [(6)]

[(6)] سورہ البقرہ؛ آیت 153

صبر اور نماز کو ایک ساتھ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مثل صلواۃ عمل کا تکرار بر قرار رکھو اور اس پر صابر ہو جاؤ، ہمت ہار کر پیچھے نا ہٹو۔

2. تقویٰ: جب آپ کے تحت افراد کی ایک جماعت آ جائے اور وہ آپ کے حکم پر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو تو ایسے میں اقتدار کی حیوانیت کو ختم کرنے کے واسطے فرد کو تقویٰ کا حصول بہت ضروری ہے تا کہ وہ خود پر ایک حاکم اعلیٰ کو تسلیم کرے اور کسی پر بھی کسی قسم کا کوئی جبر، ظلم و ستم نہ ڈھائے لہٰذا انسان کا مقصدِ وجود رضائے الٰہی کا حصول ہی ہے تو لازم ہے کہ وہ اس فرمان کو ہمیشہ یاد رکھے کہ: " اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ " (بیشک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے بیشک اللہ جاننے والا خبر دار ہے)۔ (7)

3. صدق: ہم دیکھتے ہیں کہ نطق بڑی شے ہے یہ ایسی خاصیت ہے کہ جس نے تمام ماحول کو یکسر بدل کر رکھ دیا لیکن ایک شئ جب آواز نکالتی ہے اور اس کے کچھ معنی ہوتے ہیں، اچھے یا برے تو اب اس تخریجِ صوت پر فقط زبان کی حرکت اور لبوں کی جنبش ہی کافی نہیں بلکہ مکمل عقل و شعور بھی متحرک ہو جاتے ہیں نا جانے دو ہونٹوں کے درمیان سے نکلنے والی یہ آواز امن ثابت ہو گی یا تباہی کا شور۔ لہٰذا عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسی بات کی جائے جو درست اور راست ہو۔ صدق سے مراد یہی نہیں ہے کہ بس سچ ہی بولو بھلے اس سے کسی کی گردن اتر جائے، بھلے فریقین میں جنگ لگ جائے یا پھر کوئی فساد ہو جائے، بیشتر آیات و احکامات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے مطابق صدق یہ ہے کہ جس سے فساد ٹلے، عدل قائم ہو بعض اوقات ایسا سچ جو فتنے کا باعث ہوتا ہے بولنا حرام ہے لیکن اگر صدق کا مفہوم فقط سچ بولنا لے لیا جائے تو پھر اس کی تباہیاں جھوٹ سے زیادہ ہوں گی۔ تو کسی شخص میں جب صدق جیسی صفت پیدا ہو جائے کہ کب، کہاں کتنا بولنا ہے اور کیا بولنا ہے جس میں جھوٹ کا عنصر نا پایا جائے بلکہ صاف گو اور راستی سے مزین کلام ہو تو لوگوں کا اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے جب سچ بولنے کا حکم دیا تو پہلے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو یعنی کہ سچ بولنے میں کیسا ڈر؟ وجہ یہی ہے کہ سچ کی آڑ میں ایسا نا بولو جو انتشار پیدا کرے بلکہ " يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا " (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہا کرو)۔ (8)

4. توکل: بات بالکل عیاں ہو گئی ہے کہ جب مکر و فریب کی اس ظالم دنیا میں کوئی صفاتِ حسنہ کا مرتکب ہو گا تو تمام طاغوتی طاقتیں اس راست آدمی کے خلاف تو آئیں گی ہی ایسے میں کبھی روحانیت کا فریب اور کبھی مادیت کی مسیحائی کسی کو بھی مقصدِ وجود سے بھٹکا سکتی ہے مگر ایک باوصف آدمی اپنے خالق پر مکمل بھروسہ کرنے سے باقی رہ سکتا ہے اور یہ وصف انسان کو دلیر بناتا ہے کہ خالق نے اگر مجھے پیدا کر کے یہاں بھیجا ہے تو کوئی مقصد ضرور ہو گا اور ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ بن مقصد پورا ہوئے ہم یہاں سے لوٹ جائیں؟ اس واسطے موت تب تک نہیں آ سکتی جب تک ہم اپنے حصے کا کام کر نہیں چکے اور اگر موت آ گئی تو یعنی مقصد پورا ہوا، اس

---

(7) (سورہ الحجرات: آیت 13)

(8) (سورہ احزاب: آیت 70)

کے بعد بھی جینے کی خواہش خوامخواہ میں زحمت ہے کہ ہم تو جس کار کی خاطر آئے تھے وہ پورا ہو چلا اور جس کا کام تھا اسی نے بھیجا اسی نے بلایا ہم اپنی مرضی سے آئے نا اپنی مرضی سے چلے۔ تو جن کا توکل دنیا کے کچے سہاروں اور عارضی وسائل پر ہو ان کے ہاتھوں میں سوائے دھوکے کے کیا آئے گا؟ اور جس کا توکل اللہ پر ہو اسے یہ نوید سنا دو کہ "وَ مَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ" (جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اسے کافی ہے بیشک اللہ اپنا کام پورا کرنے والا ہے)۔ [9]

5. شکر: دنیا میں آنا اور مقصدِ حیات جان کر اس کے واسطے تگ و دو کرنا ہی انسان کے شایانِ شان ہے بیشک یہی سعی کے واسطے یہ پیدا کیا گیا ہے کہ عمر بھر اللہ کے حضور جھک کر یہی کہتا رہے کہ

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے

اور نظر دوڑائے اقوامِ عالم پر کہ کون ہے جو ایسا مقدس فریضہ لیے ہوئے دنیا میں آیا اور پھر اس کی تکمیل کے ساتھ ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا بیشک اس عنایت پر اللہ کا شکر ہے اور یہ شکر قول و فعل دونوں سے ہونا چاہیے کیوں کہ یہ رائیگاں نہیں جاتا اس کا بدلہ دیا جاتا ہے کہ " وَ اِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّکُمۡ لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ " (اور یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان فرما دیا کہ اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا)۔ [10]

اختتامیہ:

صفات کو اس طرح تین پیراؤں میں تفصیلاً ذکر کرنا ضروری تھا تاکہ آئندہ مدعا سمجھنا سہل ہو جائے اور ہم جان لیں کہ اخلاق و کردار کی بنیاد کس طرح ایک شخصیت میں تشکیل پاتی ہیں اور اس کے کونسے اثرات کب کیسے مرتب ہوتے ہیں، کب یہ صفات بدلتی ہیں اور کب اپنی اصل میں لوٹتی ہیں نوعیت الگ ہونے سے صفات کا وجود کیسا رہتا ہے یہ سب ہم نے لکھ دیا ہے اور آئندہ جانیں گے کہ کس طرح صفات سبب بنتی ہیں کسی شخصیت کی تعمیرِ اخلاق و کردار میں۔

---

[9] سورہ الطلاق:3

[10] سورہ ابراھیم:7